مولانا احمد اللہ شاہ شہیدؒ

از: حضرت مولانا محمد میاں صاحبؒ

عزم وہمت، حمیت ملّی اور غیرتِ وطن کا وہ شعلۂ جوالہ جو ''چنیاپٹن'' (۱) سے اُٹھا، دہلی اور آگرہ میں چمکا، سرزمین اودھ میں چٹخا، روہیل کھنڈ میں شعلہ افشاں ہوا۔ پھر اسی کے ایک گوشہ میں محو سکون ہوگیا۔ اس کو ۱۸۵۷ء کی جانِ مضطرب کہا جائے یا شہداء ۱۸۵۷ء کا سرتاج، دونوں درست۔ اپنے تو اپنے غیر بھی (۲) اس کے علم وعمل، قوتِ روحانی اور جرأتِ ایمانی کے معترف ہیں۔

اصل نام، ولدیت اور سلسلۂ نسب

تاریخِ آزادی کے ہیرو، وطنِ عزیز کے بہادر فرزند، فداء ملک وملّت، سلطان فتح علی عرف سلطان ٹیپو (شہید) کے ایک مصاحب، سیّد محمد علی نواب چنیاپٹن تھے۔ انہیں نواب محمد علی کے یہاں ۱۲۰۴ھ میں ایک لڑکا پیدا ہوا۔ باپ کے نام کی مناسبت سے احمد علی نام رکھا گیا۔ مگر عجیب بات یہ ہے کہ اصل نام سے شہرت بہت کم ہوئی۔ پہلے ضیاء الدین عرف رہا، دلاور جنگ خطاب۔ اور جب یہ لڑکا عمر عزیز کی تقریباً چھ دہائیاں طے کرنے کے بعد جدوجہد آزادی کا علمبردار ہوا تو احمد اللہ شاہ کہلانے لگا۔ رحمہ اللہ۔

سیّد محمد علی، سیّد جلال الدّین عادل کے فرزند ارجمند تھے۔ سیّد جلال الدّین جو خاندانِ قطب شاہی (فرمانروائے گولکنڈہ) کی یادگار (۳) تھے۔ ایک طرف چنیاپٹن کے رئیس اور نواب تھے تو دوسری جانب ایک باخدا بزرگ تھے جو اپنے زمانہ کے ولی اور قطب سمجھے جاتے تھے۔

تعلیم وتربیت اور طبعی رجحانات

خاندانی عظمت کے بموجب آپ کی تعلیم وتربیت امیرانہ ہوئی اور اس زمانہ کے رواج کے مطابق علومِ دینی کے ساتھ فنونِ حرب کا بھی ماہر بنایا گیا۔ ہوش سنبھالا تو طبیعت کا میلان اورادو

وظائف کی طرف تھا۔ نماز، روزہ اور احکامِ شریعت کے سخت پابند تھے۔ ہر عمل میں سُنّتِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اتباع ضروری سمجھتے تھے۔ والدین سے ٹیپو سلطان کی شہادت اور سلطنت خداداد کی تباہی کا حال سُنا تو حکومت اور مال و دولت سے دل بیزار ہو گیا۔(۴)

سیاحت و بیعت

جوانی کا آغاز تھا کہ سیاحت کا شوق ہوا۔ پہلے حیدرآباد گئے۔ پھر یورپ کا سفر کیا۔ انگلستان جا کر ملکہ وکٹوریہ کے مہمان ہوئے۔ وہاں سے واپس ہوکر عربی ممالک کا دورہ کیا۔ حج بیت اللہ شریف سے مشرف ہوئے۔ پھر ایران ہوکر چمن کے راستہ سے ایک عرصہ کے بعد ہندوستان پہنچے۔ یہاں ''سانبھر'' کے علاقے میں ڈیرے ڈال دیئے۔(۵)

پھر مراحلِ سلوک طے کرنے اور رُوحانی کمالات حاصل کرنے کی تڑپ پیدا ہوئی حضرت قربان علی شاہ کی شہرت سن کر جے پور گئے۔ ریاضت و مجاہدہ اور چلّہ کشی کے انوار پہلے سے موجود تھے۔ بیعت نے فوراً ہی نسبت مشائخ کا کیف پیدا کر دیا۔ حضرت قربان علی شاہ صاحب نے جس طرح رُوحانی فیوض و کمالات سے مالا مال کیا، اصلاح صوفیاء اور تنظیمِ مجاہدین کا فرض بھی آپ کے ذمہ کر دیا، اور ہاں محفلِ سماع کی بھی اجازت دے دی۔(۶) بہرحال مولانا احمد اللہ شاہ صاحب جے پور سے ٹونک تشریف لے گئے نواب وزیر الدولہ سے مجلسیں گرم رہیں۔

ٹونک کی آب و ہوا آپ کے ذوقِ سماع کے موافق نہیں تھی۔(۷) مگر ذوقِ جہاد کے لئے سب سے موافق آب و ہوا اسی ٹونک کی تھی۔(۸) جو حضرت سیّد احمد شہید کے پس ماندگان کا مرکز تھا اور ابھی چند سال ہوئے، حضرت مولانا نصیر الدین صاحب دہلوی کا جہادی قافلہ، وزیر الدولہ کے دماغ کو سرشار کرتا ہوا یہاں سے گذرا تھا۔

حضرت مولانا سیّد احمد اللہ شاہ صاحب ٹونک سے رُخصت ہوکر گوالیار پہنچے یہاں ایک بزرگ محراب(۹) شاہ قلندر تھے۔ ان کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ اُن کے مشائخانہ اطوار نے آپ کے دل کو موہ لیا۔ یہ قلندر صاحب بھی عجیب تھے۔ دنیا و مافیہا سے بے خبر، مگر راہ و رسمِ انقلاب سے باخبر۔ ظالم فرنگی کے دشمن اور استخلاصِ وطن کے دلدادہ۔

مولانا سیّد احمد اللہ شاہ صاحب نے قلندر صاحب کے حلقۂ ارادت میں داخل ہونا چاہا تو داخلہ کی شرط یہ تھی کہ جہاد کی سوکھی رگوں میں تازہ خون دوڑائیں گے اور وطنِ عزیز کو انگریزوں سے نجات دلائیں گے۔ شاہ صاحب نے بسر و چشم یہ شرط منظور کی اور سلسلۂ قادریہ میں آپ سے

بیعت ہوکر خرقۂ خلافت حاصل کرلیا۔ (۱۰) یہ بتانا مشکل ہے کہ کتنے عرصہ آپ نے گوالیار میں قیام کیا۔ البتہ اس موقعہ پر یہ فراموش نہ ہونا چاہئے کہ تقریباً تیس سال پہلے جب حضرت سیّد احمد شہید رحمۃ اللہ علیہ جہاد کے لئے روانہ ہوئے تھے تو سب سے پہلے تقریباً دو ہفتہ تک آپ کا قیام یہیں رہا تھا۔ پھر راجہ ہندو راؤ اسی ریاست کے مدارالمہام تھے جن کے نام سیّد صاحب نے مرکزِ جہاد سے خط لکھ کر اُن کو جنگِ آزادی کے لئے اُبھارا تھا۔

دہلی مرکزِ سیاست اور اس کی موجودہ حالت

جہادی قلندر حضرت محراب علی شاہ کے دستِ مبارک پر عہدِ جہاد کرنے کے بعد عزم وعمل کا وقت آیا تو قدرتی طور پر حضرت مولانا سیّد احمد اللہ شاہ صاحب کی نظر دہلی کی طرف اُٹھی کیونکہ:

(۱) اگر چہ انگریزی اقتدار کا مرکز کلکتہ اور اس کا فورٹ ولیم تھا مگر ہندوستانیوں کی سیاست کا مرکز اب بھی دہلی تھا۔

(۲) یہاں مغل سلاطین کا جانشین موجود تھا جو سیاسی لحاظ سے مفلوج و مجبور ہونے کے باوجود اُن بیشمار ہندوستانیوں کے جذبات پر حکمراں تھا جو مغلِ اعظم ہی کے کسی وارث کو سلطنت وحکومت کا صحیح مستحق سمجھتے تھے۔

(۳) یہی دلّی تھی جس کی ولی اللّٰہی تربیت گاہ میں ''رُوحِ انقلاب'' نے جنم لیا تھا۔ جہاں شاہ عبدالعزیز صاحب کی تربیت گاہِ سیاسی میں وطنِ عزیز کو نجات دلانے کی تحریک پروان چڑھی تھی اور اُس نے اپنا دورِ شیرخوارگی پورا کیا تھا۔ جہاں جنگ حریت کے سب سے علمبردار سید احمد شہید کو پرچم قیادت عطا ہوا تھا۔ جہاں سے چند سال پہلے مولانا نصیرالدین صاحب دہلوی کی زیرسیادت سرفروشانِ حریّت کا آخری قافلہ روانہ ہوا تھا۔

(۴) یہی دلّی تھی جہاں بقول مولانا عبیداللہ سندھی اب بھی ولی اللّٰہی تحریک کی وہ مرکزی جماعت موجود تھی جس کی رہنمائی حضرت مولانا شاہ اسحاق صاحب اپنی ہجرت گاہ مکہ معظّمہ سے فرمارہے تھے۔

اس قسم کی متعدد وجوہات تھیں جن کی بناء پر مولانا سیّد احمد اللہ شاہ صاحب کا قدم سب سے پہلے دہلی کی سمت اُٹھنا ضروری تھا۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ لیکن اس وقت کی صورتِ حال نے جو نزاکتیں پیدا کردی تھیں، اُن کا احساس مولانا سیّد احمد اللہ شاہ صاحب کو گوالیار میں نہیں ہوسکا یا پوری طرح نہیں ہوسکا۔ مثلاً:

(۱) گذشتہ چالیس سال میں جس طرح دہلی حضرت سیّد احمد شہیدؒ، حضرت مولانا اسمٰعیل شہیدؒ، حضرت مولانا نصیرالدین دہلوی شہیدؒ، حضرت مولانا شاہ اسحاق صاحب رحمۃ اللہ علیہ وغیرہ کی تحریکات کا مرکز رہی۔ اس کا تقاضا تھا کہ بقول مولانا عبیداللہ سندھی:

''یہاں ریزیڈنٹ کی نگاہ بہت سخت ہو۔''

(۲) شاطرانِ انگریز یہ طے کرچکے تھے کہ بہادر شاہ پر بادشاہت کے موجودہ طمطراق کو بھی ختم کردیا جائے۔ لال قلعہ جو عظمتِ ہندوستان کا آخری نشان سمجھا جاتا تھا، اس کو بہادر شاہ کے جانشین سے خالی کرالیا جائے۔ اس کے لئے جو تدبیریں عمل میں لائی جارہی تھیں اور جس طرح شاہزادوں سے سازباز کا سلسلہ جاری تھا، اس کا یہی تقاضا تھا کہ ریزیڈنٹ کی نگاہیں سخت اور محتاط رہیں۔

(۳) حضرت مولانا سیّد احمد اللہ شاہ صاحب کے دہلی تشریف لانے کا سال معین نہیں ہوسکا۔ قیاس[۱۱] یہ ہے کہ ۱۸۴۶ء یا ۱۸۴۷ء میں آپ دہلی تشریف لائے ہوں گے یعنی تقریباً ۱۲۶۴ھ۔ یہ وہ زمانہ تھا کہ پنجاب میں سکھ حکومت کو ختم کیا جارہا تھا۔ جس سے پورے پنجاب میں بددلی پھیلی ہوئی تھی۔ علاقہ ملتان کی فوجیں زیر قیادت دیوان مول راج انگریزوں سے جنگ کی تیاریاں کررہی تھیں۔ پٹھانوں نے زیر قیادت سلطان محمد خاں و دوست محمد خاں علمِ بغاوت بلند کررکھا تھا۔ بالاکوٹ کا رئیس سیّد ضامن شاہ انگریزوں کے دوست گلاب سنگھ مہاراجہ کشمیر سے برسرِ پیکار تھا اور اُس کی امداد کے لئے مرکز صادق پور سے مجاہدین کا ایک دستہ مولانا ولایت علی صاحب کی زیر قیادت بالاکوٹ پہنچ چکا تھا اور شہادتِ مجاہدانہ کی پُرانی تمنائیں سرفروشی سے پوری کررہا تھا۔ اور جیسا کہ اسی سلسلہ کی تیسری جلد میں بیان کیا گیا ہے بقول مسٹر دیبی پرشاد مصنّف گلشنِ پنجاب، پورے ہندوستان بالخصوص شمال مغربی صوبہ (پنجاب وفرنٹیئر وکشمیر) میں غلغلہ مچ رہا تھا۔

ان نزاکتوں کے علاوہ سیاسی مصلحتوں کا بھی تقاضا یہی تھا کہ جو تحریک موجودہ حالات کے مطابق چلائی جائے، اُس کا مرکز دہلی نہ ہو۔

اسلامی جہاد کی نوعیت سے جو تحریک سیّد احمد شہیدؒ، مولانا اسمٰعیل شہیدؒ اور ان کے بعد مولانا نصیرالدین صاحب دہلوی رحمۃ اللہ علیہ نے چلائی تھی، اس کی ناکامی ثابت ہوچکی تھی، اب ایک عوامی تحریک کی ضرورت تھی۔ دہلی اگرچہ مرکزِ سیاست تھی، مگر یہاں تحریکِ حریت ایک خاص حلقہ سے مخصوص تھی۔ یہ حضرت شاہ عبدالعزیز صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے شاگردوں اور مریدوں کا حلقہ تھا۔ بے شک اس حلقہ کے اثرات پورے ہندوستان میں پھیلے ہوئے تھے مگر شاطرانِ برطانیہ نے وہابیت کے جس الزام سے حضرت سیّد احمد صاحب کی تحریک کو سرحد میں ناکام کیا تھا۔ جیسا کہ

شاندار ماضی کی جلد دوم میں واضح کیا جاچکا ہے وہ الزام اگر چہ قطعاً بے بنیاد تھا مگر کچھ اپنوں کی ناعاقبت اندیشی اور زیادہ تر کلکتہ کے سرکاری دارالافتاء نے مسلسل پروپیگنڈہ کرکے اس بیس سال کے عرصہ میں اس الزام کو اس حد تک حقیقت کا درجہ ضرور دے دیا تھا کہ حضرت شاہ عبدالعزیز صاحب رحمۃ اللہ علیہ یا حضرت سیّد احمد شہید صاحب رحمۃ اللہ علیہ سے تعلق رکھنے والا حلقہ صرف سیاسی نہیں رہا بلکہ مذہبی نقطۂ نظر سے ایک مکتبہ خیال بن گیا تھا۔

اب تدبّر اور سیاسی دُور اندیشی کا مطالبہ یہ تھا کہ آئندہ تحریک کی دعوت ایسے انداز سے دی جائے کہ جو عناصر اس مکتبۂ خیال سے تعلق نہیں رکھتے وہ بھی تحریک سے وابستہ ہوں اور مکتبۂ خیال کی حد بندی ان کی شرکت یا قیادت کے راستہ میں حائل نہ ہوسکے۔ اس مصلحت کے پیش نظر حضرت مولانا سیّد احمد اللہ شاہ صاحب بہترین شخص تھے جن کی قدرت کے پوشیدہ اشاروں نے خود بخود دہلی کے سیاسی مدبّرین کے پاس پہنچا دیا تھا۔

دہلی کے بعد آگرہ

شاہ جہاں آباد (دہلی) اور اکبر آباد (آگرہ) کا پُرانا رشتہ اگر چہ اب کمزور ہوچکا تھا مگر تعاون اور اعتمادِ باہمی کی رُوح ابھی فنا نہیں ہوئی تھی، اور اگر چہ چند سال پہلے آگرہ ملّی رجحانات اور قومی جذبات کے لحاظ سے ایک شہرِ خموشاں[۱۲] بن چکا تھا مگر جب سے وہ برطانوی صوبہ کا دارالحکومت بنا تھا اس میں پھر چہل پہل ہوگئی تھی اور ذی استعداد صاحبِ فکر علماء وفضلاء کا ایسا مجمع اس کو میسر آگیا تھا جس کی نظیر کوئی دوسرا شہر مشکل سے پیش کرسکتا تھا۔ ان علماء میں اگر چہ زیادہ وہ تھے جو حضرت مولانا شاہ عبدالعزیز صاحب قدس اللہ سرہ العزیز سے تلمذ اور (بالواسطہ یا بلاواسطہ) شاگردی کا تعلق رکھتے تھے۔ مگر غالباً ایسا کوئی بھی نہیں تھا جو ایک مکتبۂ خیال کے پابند کی حیثیت سے حضرت شاہ عبدالعزیز صاحبؒ یا حضرت سیّد احمد شہیدؒ سے وابستہ ہو۔

مختصر یہ کہ مختلف مکاتبِ خیال اور مختلف سلسلہ تلمذ کے اور فضلاء یہاں رونق افروز تھے اور آگرہ گلہائے رنگارنگ کا گلدان بنا ہوا تھا۔ ایک عوامی تحریک کا لالہ زار ایسا ہی گلستان بن سکتا تھا۔ دہلی کے اربابِ بصیرت نے اسی مصلحت سے آگرہ کو منتخب کیا اور حضرت مولانا سیّد احمد اللہ صاحب شہید کی عنانِ توجہّ دہلی کے آگرہ کی طرف منعطف کی۔

لیکن آگرہ حضرت مولانا سیّد احمد اللہ شاہ صاحب کے لئے بالکل اجنبی شہر تھا۔ اس کے لئے ایک عرصہ درکار تھا کہ مولانا سیّد احمد اللہ شاہ صاحب آگرہ پہنچ کر اعتماد حاصل کریں اور وہاں کے

سربراہوں اور کلیدی حضرات تک پہنچ سکیں۔

حضرت مولانا مفتی صدرالدین صاحب جیسا اعلیٰ مدبّر جس نے حضرت سیّد احمد اللہ شاہ صاحب کی سیاسی تگ و دو کے لئے آگرہ کا میدان منتخب فرمایا۔ آپ نے خود ہی اس کی ذمہ داری بھی لی کہ حضرت مولانا شاہ احمد اللہ صاحب جیسے ہی آگرہ پہنچیں، بلا کدوکاوش کلیدی حضرات تک اُن کی رسائی ہوجائے اور یہ اُن کا اعتماد حاصل کرلیں۔ چنانچہ حسبِ روایت مفتی انتظام اللہ صاحب شہابی:

> مفتی انعام اللہ خان بہادر جو محکمہ شریعت کے مفتی رہ چکے تھے، اب سرکاری وکیل تھے۔ حضرت آزردہ (مفتی صدرالدین صاحب آزردہ) کے خط کے ذریعہ شاہ صاحب (مولانا احمد اللہ شاہ صاحب) اُن کے یہاں آکر مقیم ہوئے۔ اُن کا گھر علماء کا مرکز بنا ہوا تھا۔ مفتی صاحب کے صاحبزادے مولوی اکرام اللہ صاحب ''تصویر الشعراء'' مرید ہوئے۔

مجلسِ علماء

علماء وفضلاء کرام کا یہ گلدستہ جس کی شیرازہ بندی اب تک علمی اور ادبی ذوق نے کررکھی تھی، مولانا احمد اللہ شاہ صاحب کے پہنچنے کے بعد اُس میں سیاسی رنگ پیدا ہونا شروع ہوا، اور مجلس کی شکل میں اس اجتماع کی تشکیل کی گئی اس کے ارکان کی مختصر فہرست ملاحظہ ہو۔

مولوی شیخ اعتقاد علی بیگ صاحب، مولوی امام بخش صاحب، سیّد باقر علی صاحب ناظم محکمہ دیوانی، مولوی نورالحسن صاحب، سیّد مراتب علی صاحب، مولوی خواجہ تراب علی صاحب، سیّد حسن علی صاحب، رحمت علی صاحب، مفتی ریاض الدین صاحب، مولوی غلام جیلانی صاحب، غلام مرتضیٰ صاحب، شیخ محمد شفیع صاحب، مولوی عبدالصمد صاحب، مولوی منصب علی صاحب، مولوی محمد عظیم الدین حسن صاحب، رسول بخش صاحب، باسط علی صاحب، مومن علی صاحب، محمد قاسم صاحب داناپوری، معین الدین صاحب، مولوی کریم اللہ خان صاحب صدرالصدور، قاضی محمد کاظم علی صاحب، تاج الدین صاحب، طفیل احمد صاحب خیرآبادی، مولانا غلام امام شہید، مفتی عبدالوہاب صاحب گوپامئوی، ڈاکٹر وزیرخاں صاحب، مولوی فیض احمد صاحب بدایونی، مفتی انعام اللہ صاحب۔

یہ حضرات صدارت نظامت کے مختلف عہدوں پر فائز تھے، یا وکلاء تھے، جنھوں نے اس

مجلس کی رُکنیت منظور کی، اور دامے درمے قدمے شاہ صاحب کی تائیدواعانت شروع کردی۔

حلقۂ ارادت

حضرت سیّد احمد شہید رحمۃ اللہ علیہ کے حالات شاندار ماضی جلد دوم میں گذر چکے ہیں۔ انہیں کا نمونہ حضرت مولانا سیّد احمد اللہ شاہ صاحب کے حالت میں بھی نظر آتا ہے۔فرق یہ ہے کہ جوگرمی وہاں صرف ذکراللہ سے پیدا کی جاتی تھی، شاہ احمد اللہ صاحب کے یہاں اس کے لئے ''سماع'' سے بھی کام لیا جاتا تھا۔(۱۳)

بہر حال حضرت سیّد احمد اللہ شاہ صاحب کے حلقۂ بیعت وارادت نے وسعت اختیار کی۔ محفلِ سماع خود ایک کشش رکھتی ہے۔ یہاں علم وفضل کے ساتھ قوتِ خطابت کا یہ عالم تھا کہ جہاں آپ کے وعظ کا اعلان ہوتا، ہندو مسلمانوں کا بے پناہ ہجوم ہوجاتا۔ اب ایک وقت ذکر وشغل اور مراقبہ کا سلسلہ ہوتا، دوسرے وقت محفلِ سماع کی گرمجوشی(۱۴) کبھی عام جلسے ہوتے جن میں دس دس ہزار کا اجتماع ہوتا۔ سُننے والے بے قرار ہوجاتے۔ ہر شخص قربان اور فدا ہونے کا عہد کرتا۔ دوسرے تیسرے روز نمازِ عصر کے بعد قلعہ اکبر آباد کے میدان میں فنِ سپہ گری کی مشق کرائی جاتی۔ خود شاہ صاحب بہترین نشانہ باز تھے۔تلوار کے ہاتھ بھی بہت جچے تُلے ہوتے تھے۔

آپ کہیں تشریف لے جاتے تو مریدین کا ہجوم ساتھ ساتھ رہتا۔آگے آگے ڈنکا بجتا۔اس لئے آپ کو ڈنکے والا پیر یا ڈنکا شاہ کہا جاتا۔

وہی آگرہ جس کی جامع مسجد کو جمعہ کے روز بمشکل بیس پچیس نمازی نصیب ہوتے تھے۔ اب اس کی ایک ایک مسجد میں سینکڑوں کا ہجوم ہوتا تھا۔ جو مسجدیں عرصہ سے ویران تھیں، اب اُن کی آبادی پر لوگ حیرت کرتے تھے۔آگرہ شہر اس طرح مسخر ہوگیا تو آپ نے مضافات کا قصد کیا۔ جہاں آپ پہنچتے، مریدین کی جماعت ساتھ رہتی اور ایک ہی دورہ میں اس کا رنگ بدل جاتا۔عوام کو یاد ہو یا نہ یاد ہو، مگر انگریز کو حضرت سیّد احمد شہیدؒ کا دَور یاد تھا۔ حضرت مولانا سیّد احمد اللہ شاہ کے اس دَور میں وہی رنگ دیکھا تو تیس سال پہلے کی تمام تاریخ سامنے آگئی۔

حضرت شاہ صاحب سے تعلق رکھنے والوں پر مقدمہ

انگریز بہادر نے حضرت شاہ صاحب پر ہاتھ نہیں ڈالا، یا بقول مولوی سیّد طفیل احمد صاحب مرحوم، پولیس نے اُن کو (مجسٹریٹ کے حکم پر) گرفتار کرنے سے انکار کردیا(۱۵) البتہ وہ جماعت

جوانگریزوں سے ملازمت کا تعلق رکھتی تھی اور اب شاہ صاحب سے وابستہ ہوگئی تھی اور انہیں کے ذریعہ حضرت شاہ صاحب آگرہ میں قیام کر کے اپنا اثر جما سکے تھے، اُس پر رشوت کا مقدمہ چلا دیا۔ مراد آباد کے جج مسٹر ولسن مقدمہ کی سماعت کے لئے مقرر کئے گئے۔ حضرت شاہ صاحب اس وقت قصبات ومضافات کے دورہ پر باہر تشریف لے گئے تھے۔ آپ کو سفر ہی میں اس مقدمہ کا علم ہوا تو آپ نے فرمایا۔ یہ امتحان کی پہلی منزل ہے۔ گھبرائیں نہیں، انشاء اللہ کامیاب ہوں گے۔ کسی پر بھی کوئی آنچ نہیں آئے گی۔

بہرحال مقدمہ شروع ہوا۔ پولیس نے گواہ پیش کئے۔ مگر یہ بناوٹی گواہ بیکار ثابت ہوئے۔ خدا جانے پولیس نے کیا کہہ کر اُن کو تیار کیا ہوگا۔ مگر جب وہ اجلاس میں یہ دیکھتے کہ جس کے برخلاف وہ گواہی دینا چاہتے ہیں، وہ ایک باخدا عالِم دین ہے تو گھبرا جاتے اور بقول مفتی انتظام اللہ شہابی:

''جھوٹی گواہی دینے کی جرأت نہ ہوتی۔''

بہرحال جوں توں کر کے ابتدائی عدالت میں سخت سخت سزائیں تجویز کی گئیں۔ مولوی غلام جیلانی وکیل صدر، مولوی غلام احمد شہید پیش کار اور مفتی سراج الدین پیش کار کو چار چار سال کی قید بامشقّت، مفتی محمد قاسم صاحب داناپوری مسل خواں کو تین سال مولوی بدرالحسن صاحب مسل خواں اور مولوی آل حسن منصف کو دو دو سال۔

ایک اخبار ''سعد الاخبار'' نے اس خبر کو شائع (۱۶) کرتے ہوئے لکھا:

''دیکھنے کی بات یہ ہے کہ مولانا محمد قاسم داناپوری جن کا شمار اولیاء کرام میں ہے اور اُن کے ہزارہا مرید صاحبِ ریاضت ومجاہدہ ہیں، اُن کو رشوت سے متہم کیا جاتا ہے، تعجب ہے۔ دوسرے صاحب مولانا غلام امام شہید جو عاشقِ رسول کہلاتے ہیں، اُن کے بھی ہزارہا مرید آگرہ حیدرآباد ومرادآباد میں ہیں، اُن پر بھی رشوت کا الزام ہے۔''

بہرحال فوراً ہی اپیل دائر کیا گیا۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ سب حضرات بری کر دیئے گئے۔ بقول حضرت شاہ صاحب کسی کا بھی بال بیکا نہ ہوا۔

خان بہادر مفتی انعام اللہ صاحب (۱۷) وکیل صدر جن کے نام شاہ صاحب حضرت مولانا مفتی صدرالدین صاحب آزردہ کا خط لائے تھے، جو سب سے پہلے حضرت شاہ صاحب کے میزبان بنے تھے، یہ بھی معطل کئے گئے۔ الزام یہ تھا کہ مُشتبہ خطوط اُن کے یہاں سے برآمد ہوئے ہیں۔ (۱۸)

آگرہ سے کانپور اور لکھنؤ

مولانا احمد اللہ شاہ صاحب آگرہ میں مقیم تھے کہ اودھ میں مولانا امیر علی شاہ رحمۃ اللہ علیہ کی شہادت کا ہنگامہ پیش آگیا۔ آپ کو اس کی تفصیلات کا علم ہوا تو آپ نے فرمایا۔ ''اب ہمارے کام کا وقت آگیا۔'' چنانچہ آپ نے سفر کی تیاری شروع کردی۔ مریدین کا بھی ایک جم غفیر ساتھ ہولیا۔ اس طرح کہ ہر ایک مرید نے توشہ ساتھ لے لیا تھا اور گھر بار کا معقول انتظام کردیا تھا۔ ماؤں نے بیٹوں کو اجازت دی تھی، اور بیویاں شوہروں کو رخصت کررہی تھیں۔ ہر ایک کا دل مگن تھا۔ مرشد ساتھ ہے کوئی خطرہ نہیں ہے۔(۱۹)

شاہ صاحب آگرہ سے روانہ ہوکر پہلے کانپور پہنچے۔ وہاں عظیم اللہ خاں وغیرہ سے ملاقاتیں رہیں۔ پھر آپ اُناؤ ہوتے ہوئے لکھنؤ پہنچے۔ گھاس منڈی میں قیام کیا۔ وہیں مولانا فضل حق صاحب خیرآبادی سے ملاقات ہوئی۔ مفتی انتظام اللہ صاحب شہابی تحریر فرماتے ہیں:

''مولانا فضل حق صاحب خیرآبادی جو خالص سرکاری آدمی تھے اُن دنوں لکھنؤ میں صدرالصدور تھے۔ کچھ دن گذرے تھے کہ مولوی عبدالرزاق صاحب فرنگی محلی کی تائید میں مولانا امیر علی شاہ(۲۰) صاحب کے خلاف فتویٰ صادر کرچکے تھے۔ وہ (مولانا خیرآبادی) شاہ صاحب سے ملنے آئے۔ شاہ صاحب سے ایسی گفتگو ہوئی کہ گھر جاتے ہی صدرالصدوری سے استعفیٰ دیدیا اور الور چلے گئے اور انگریزوں کے جتنے خیرخواہ تھے، اُتنے ہی(۲۱) دشمن ہوگئے۔(۲۲)

لکھنؤ نے تقریباً چالیس سال پیشتر حضرت سیّد احمد شہید کا استقبال بھی بڑی شان سے کیا تھا۔ وہی روح وہاں بھی کارفرما تھی، اور اہلِ لکھنؤ حضرت سیّد صاحب کے زمانہ کی بہ نسبت اب زیادہ زخم خوردہ ہوچکے تھے۔ انتہا یہ کہ اُن کا بادشاہ واجد علی شاہ جس کو انگریز خواہ کچھ بھی کہیں مگر حقیقت یہ ہے کہ وہ لکھنؤ والوں کی آنکھ کا تارا اور باشندگانِ اودھ کی آزادی کا آخری نشان تھا، وہ بھی انتہائی ذلّت وخواری کے ساتھ اُن سے جُدا کردیا گیا تھا، یا جدا کیا جانے والا تھا۔

بہرحال حضرت سیّد صاحب شہیدؒ کی طرح حضرت مولانا احمد اللہ شاہ صاحب بھی مقبول اور محبوب ہونے لگے اور باشندگانِ لکھنؤ کی والہانہ وابستگی آپ سے دن بدن بڑھنے لگی۔ مگر اس انتہائی نازک دَور میں کہ بارک پور والی فوج برخواست کی گئی تھی جس کے سپاہی زیادہ تر اودھ کے رہنے والے تھے۔ ادھر واجد علی شاہ کو معزول کرکے گرفتار کرلیا گیا تھا یا گرفتار کرنے کا منصوبہ تیار کیا جارہا تھا۔ حضرت مولانا احمد اللہ شاہ صاحب جیسے انقلابی امام کا لکھنؤ میں قیام کرنا خود شاہ صاحب کے لئے خطرناک تھا، اور تحریک کے لئے بھی تشویش ناک۔ اس لئے شاہ صاحب نے لکھنؤ کا قیام

مختصر کر کے فیض آباد کا رُخ کیا۔اب شاہ صاحب نے تمام تکلفات برطرف کر دیئے تھے اور بقول مولانا فتح محمد تائب لکھنوی:

نصاریٰ سے جو حکم پیکار تھا ہر ایک شخص سے اس کا اظہار تھا

اس عریانی کا نتیجہ ظاہر تھا۔ایسٹ انڈیا کمپنی کے عمال نے آپ کو گرفتار کرنا چاہا۔مگر عوام کے ہجوم اور اُن کی بے پناہ عقیدت کے باعث پولیس یہ جرأت نہ کر سکی،تو فوج سامنے آئی۔حضرت شاہ صاحب اور آپ کے ساتھیوں نے مقابلہ شروع کر دیا۔مگر چونکہ فوج کا یہ اقدام دفعتہً تھا،شاہ صاحب اور آپ کے ساتھی پہلے سے تیار نہ تھے اس لیے یہ مقابلہ بھی ناکام ہی رہا۔حضرت شاہ صاحب کسی فوجی کی تلوار کی ضرب سے بے ہوش ہو کر گر پڑے۔آپ کو فوراً گرفتار کر کے جیل خانہ بھیج دیا گیا۔آپ کے ساتھی بھی گرفتار کر لئے گئے۔

تحریکِ انقلاب ۱۸۵۷ء کا آغاز

یہ ۱۸۵۶ء کے اواخر یا ۱۸۵۷ء کے شروع کا واقعہ ہے چند ماہ بعد ۱۰ر مئی ۱۸۵۷ء کی طوفان انگیز تاریخ آئی جس نے پورے شمالی ہند کی زمین ہلا دی۔حضرت شاہ صاحب اس وقت جیل میں تھے۔فیض آباد میں عنانِ قیادت ایک اور صاحب نے سنبھالی۔اُن کا اسم گرامی مولانا سکندر شاہ صاحب فیض آبادی تھا۔آپ نے جیل خانہ پر دھاوا بول کر حضرت شاہ صاحب کو تو چھڑا لیا لیکن خود انگریزی فوج کے ہاتھوں گرفتار ہو گئے۔مگر مولانا احمد اللہ شاہ صاحب نے جھنڈے کو گرنے نہیں دیا۔اپنی رہائی کے بعد پورے ہندوستان کی رہائی کے لئے پرچم لہرایا،اور جو فدایان وطن جمع ہوئے تھے اُن کو ساتھ لے کر لکھنؤ کا رُخ کیا۔(۲۳)

بقول مولانا عبدالحلیم شرر لکھنوی مرحوم:

> جس طرح میرٹھ وغیرہ کے باغی سمٹ کر دہلی میں جمع ہوئے تھے اور ظفر کو ہندوستان کا شہنشاہ بنایا تھا،ویسے ہی الہ آباد اور فیض آباد کے باغی بھی ۱۸۵۷ء میں جوش و خروش کے ساتھ لکھنؤ پہنچے۔اُن کے آتے ہی یہاں کے بہت سے بے فکرے اُٹھ کھڑے ہوئے اور برجیس قدر کی بادشاہی قائم کر دی۔تھوڑی سی انگریزی فوج اور یہاں کے تمام یورپین عہدہ دارانِ مملکت جو باغیوں کے ہاتھ سے جاں بر ہو سکے ''بیلی گارڈ'' میں قلعہ بند ہو گئے۔(گذشتہ لکھنؤ)

بہر حال مولانا شرر کے الفاظ استعمال کیجیےٴ یا ان کو انقلاب پسند محبانِ وطن کہیے،تاریخی

حقیقت یہ ہے کہ برجیش قدر جن کی عمر صرف دس سال تھی، بادشاہ[۲۴] بنائے گئے۔ اُن کی والدہ حضرت محل جو ایک بہادر خاتون تھیں، اُن کی ولی اور سرپرست مقرر ہوئیں۔ ناصر الدولہ علی محمد خاں عرف مموخاں وزیر اعظم یا مدار المہام مقرر ہوئے، لیکن اس قیامت خیز دَور میں جس کے بل بوتے پر یہ سب کچھ ہوا، وہ مولانا احمد اللہ شاہ صاحب تھے جن پر سُنّی اکثریت پورا اعتماد کرتی تھی۔

مقابلہ، ناکامی اور وجوہاتِ ناکامی

بے شک کا نقشہ قائم ہوگیا۔ عام ہندو مسلمانوں نے دلوں کی گہرائیوں سے وفاداری کا عہد بھی اس حکومت سے کرلیا مگر جو مرض دہلی میں تھے، وہی بیماریاں لکھنؤ کی فضا میں بھی موجود تھیں بلکہ اُن سے کسی قدر زیادہ۔

یہاں شیعہ سُنّی کا مسئلہ بھی موجود تھا۔ اربابِ اقتدار کی جنگی نااہلیت بھی اپنا رنگ جمائے ہوئے تھی، اور مرزا مغل کی طرح مموخاں کی ریشہ دوانیاں بھی احمد اللہ شاہ جیسے بہادر اور دیانت دار جرنیل کے راستہ میں ہر قدم پر رکاوٹ کے لئے موجود تھیں۔ نتیجہ ظاہر تھا۔ یعنی بہادرانہ معرکوں کے باوجود ناکامی۔ جس کی تفصیل کے لئے مستقل جلد کی ضرورت ہے۔

مولانا احمد اللہ شاہ صاحب لکھنؤ سے ہٹ کر شاہ جہان پور پہنچے۔ شاہزادہ فیروز، جنرل بخت خاں، تجمل حسین خاں رئیس فرخ آباد، جنرل اسمٰعیل خاں (فتح گڈھ)، نانا راؤ پیشوا، غرض تمام ہی سرغنہ جنھوں نے بار بار شکست اُٹھانے کے بعد بھی ہمت نہیں ہاری تھی اور جو پورے عزم کے ساتھ طے کرچکے تھے ع

یا جاں رسد بجانا یا جاں زتن برآید

یہ سب جمع ہوگئے۔ شاہ جہان پور میں جو معرکے ہوئے، اُن کا مختصر تذکرہ واقعات شاہجہان پور کے سلسلہ میں پہلے گذر چکا ہے، اور جب یہاں بھی ناکامی ہوئی تو شاہ صاحب اپنے بچے کچھے ساتھیوں کے ساتھ قصبہ محمدی پہنچے اور یہاں از سرِ نو تنظیم کی۔ ایک عارضی حکومت بھی قائم کرلی۔ جس کی کابینہ کے ارکان یہ تھے:

جنرل بخت خاں	وزیر جنگ
مولانا سرفراز علی صاحب	قاضی القضاء (جیف جسٹس)
نانا راؤ پیشوا	دیوان (وزیر مال)

مولانا لیاقت علی صاحب الہ آبادی، ڈاکٹر وزیر خاں صاحب اکبر آبادی، مولانا فیض اللہ

صاحب بدایونی، شاہزادہ فیروز شاہ — ارکانِ حکومت۔

سکّہ زد برہفت کشور خادم محراب شاہ
حامیِ دین محمد احمداللہ بادشاہ

پھر کیا ہوا؟ تاریخ شاہ جہان پور اور صحیفۂ زریں کے حوالہ سے مفتی انتظام اللہ شہابی تحریر فرماتے ہیں:

ابھی شاہ صاحب پوری طرح جمنے نہ پائے تھے کہ سر کالن کیمبل نے قصبہ محمدی پر حملہ کردیا۔ خوب خوب مقابلہ رہا۔ شاہ صاحب کے ہٹتے ہی محمود خاں(۲۵) معہ حضرت محل اور نانا راؤ، عظیم اللہ خاں اور بخت خاں وغیرہ نیپال کی طرف چلتے ہوئے۔

لیکن شاہ صاحب نے پوائیں کا رُخ کیا جو بنڈیل کھنڈ اور اودھ کی سرحد پر شاہ جہان پور سے شمال مشرق تقریباً ۱۸ میل ہے۔ راجہ پوائیں اگر تعاون کے لئے آمادہ ہوجاتا تو شاہ صاحب کو پھر سانس لینے کا موقع مل سکتا تھا۔ مگر اُس نے غداری کی۔ اوّل وہ آپ سے گفتگو کے لئے آمادہ ہوا، اور جب شاہ صاحب گفتگو کے لئے پہنچے تو راجہ نے اپنی گڑھی کا پھاٹک بند کرلیا اور اُوپر سے گولیوں کی بوچھاڑ کرکے شاہ صاحب کو شہید کردیا۔ اب مفتی انتظام اللہ صاحب شہابی کا بیان ہے کہ:

راجہ بلدیو سنگھ نے سر مبارک جسم اطہر سے اُتارا، اور صاحب کلکٹر بہادر شاہ جہانپور کے سامنے پیش کردیا جو عرصہ تک کوتوالی پر لٹکا رہا۔ نعش کو آگ میں پھونک دیا۔ اس پر سرکار برطانیہ نے پچاس ہزار روپیہ نقد اور خلعتِ فاخرہ راجہ پوائیں کو عطا کیا۔ یہ واقعۂ شہادت ۵/جون ۱۸۵۸ء مطابق ۱۳/ذی قعدہ ۱۲۷۵ھ کو پیش آیا۔ دریا پار محلّہ جہاں آباد متصل احمد پور مسجد کے پہلو میں سر دفن کردیا گیا۔ مولوی سیّد طفیل احمد صاحب (علیگ مصنف روشن مستقبل وحکومت خود اختیاری) نے کتبۂ تاریخ نصب کرادیا۔(۲۶)

شاہ صاحب کے متعلق جو لکھا گیا، اس کی تصدیق کے لئے چند انگریز مؤرخین کے بیانات ملاحظہ فرمایئے۔ چارلس نال لکھتا ہے:

ایک لمبا، لاغر مگر مضبوط آدمی، دُبلے جبڑے، لمبے پتلے ہونٹ، اُونچا بانسہ، بڑی بڑی آنکھیں، تیغ نما ابرو، لمبی داڑھی، سخت کالے بالوں کی زُلفیں دونوں کانوں پر پڑی رہتی تھیں۔

چارلس نال حلیہ بیان کرنے کے بعد لکھتا ہے:

اودھ کے باغیوں کی تجاویز اور سازش کی تحقیق کی گئی تو معلوم ہوا کہ اس مولوی کو انگریزی حکام بحیثیت احمد شاہ فقیر اور صوفی عرصے سے جانتے تھے۔ شمال مغربی صوبجات میں ظاہراً مذہبی تبلیغ کی خاطر دورہ کرچکے تھے۔ لیکن فرنگیوں کے لئے یہ راز ہی رہا۔

اپنے سفر کے دوران وہ ایک عرصے تک آگرہ میں مقیم رہے۔ حیرت انگیز اثر شہر کے مسلم باشندوں پر تھا۔ شہر کے مجسٹریٹ ان کی جملہ نقل وحرکت پر نظر رکھتے تھے۔ عرصہ بعد یقین ہوگیا، کہ وہ برطانوی حکومت کے خلاف ایک سازش کررہے ہیں لیکن پھر بھی اُن کو کسی باغیانہ جرم میں ملوث نہ پایا گیا۔ وہ آزاد رہے۔ آخرکار جب بغاوت رونما ہوئی اور فیض آباد کے فوجیوں میں بھی یہ لوگ پہنچے تو یہ مولوی جو سابقاً غیر منظّم طریقے پر اپنے مریدوں کو اُبھار رہا تھا، گارڈ کی نگرانی میں تھا۔ ہنگامہ کرنے والوں نے اُن کو چھڑا کر اپنا سردار بنالیا۔ اس طرح مولوی صاحب ایک طاقت ور فوج کے سپہ سالار بن گئے۔ اگرچہ کچھ عرصہ تک دوسرے باغی سرداروں کی طاقت چھپی رہی لیکن اس شخص کا اثر باغیوں پر بھرپور تھا لیکن یہ قابل آدمی تھا، اور ظلم کے دھبے سے پاک تھا جو نانا صاحب کے انتقامی جوش کی خصوصیت تھی، اس سے یہ بالکل پاک صاف تھا۔ اس لئے برطانیہ بھی ایک حد تک ان کو اچھا اور قابل نفرت نہیں سمجھتی تھی۔ (۲۷)

جرنل ٹامسن جو ایک بہادر انگریز تھا اور ہنگامۂ ۱۸۵۷ء میں شریک تھا، شاہ صاحب کی بابت لکھتا ہے:

مولوی احمد اللہ شاہ بڑی لیاقت وقابلیت رکھتا تھا۔ وہ ایسا شجاع تھا کہ خوف اُس کے نزدیک نہیں آتا تھا۔ یہ عزم کا پکا، ارادہ کا مستقل تھا۔ باغیوں میں اس سے بہتر کوئی سپاہی نہیں تھا۔ یہ فخر اسی کو حاصل ہے کہ اُس نے دومرتبہ سرکالن کیمبل کو میدانِ جنگ میں ناکام رکھا۔ وہ بہ نسبت اور باغیوں کے خطاب شاہ کا زیادہ مستحق تھا۔ اگر محبّ وطن ہونے کے یہ معنی ہیں کہ اپنے ملک کی آزادی کے لئے جو غلطی برپا ہوگئی ہو، سازشیں کی جائیں اور لڑائیاں لڑی جائیں، تو مولوی یقیناً اپنے ملک کا محبّ صادق تھا۔ اُس نے کبھی تلوار کو مخفی اور سازشی قتل سے خون آلود نہیں کیا وہ بہادرانہ اور معجزانہ طور پر ان سے معرکہ آرا ہوا جنھوں نے اُس کا ملک چھین لیا تھا۔ دنیا کی

ساری قومیں اس کو تعظیم وادب کے ساتھ جوشجاعت وصداقت کے لئے لازمی تھیں اور جن کا مستحق تھا، اس کو یاد کریں گی۔ (۲۸)

فارسٹر کا ایک اور نذرانۂ عقیدت ملاحظہ فرمائیے:

جن کو فیض آبادی مولوی کہا جاتا ہے، اُن کے متعلق یہ بتادینا ضروری ہے کہ وہ عالم باعمل ہونے کی وجہ سے مولوی تھا۔ رُوحانی طاقت کی وجہ سے صوفی اور جنگی مہارت کی وجہ سے سپاہی اور سپہ سالار تھا۔ اس کی طبیعت ظلم سے پاک تھی۔ ہر انگریز اس کو قدر کی نگاہ سے دیکھتا ہے۔ (۲۹)

رفقاء

مفتی انتظام اللہ صاحب شہابی نے چند اسماء گرامی اس عنوان کے تحت نقل کیے ہیں۔ ان فداکارانِ حریت کے نام ہم بھی زیبِ صحیفہ کرتے ہیں:

امیر احمد، شاہ آفاق، قطب شہید، رستم علی، اسمٰعیل خاں، غلام محمد خاں، کفایت اللہ تلہری، فرقان علی، محمد شاہ خاں شہید، سعد اللہ خاں شہید، نور احمد، احمد یار خاں تحصیل دار، نواب غلام قادر خاں (بٹول) عبدالرؤف خاں۔

اکثر انڈمان بھیجے گئے۔ کچھ کو دار نصیب ہوئی۔ کچھ گوشہ گیر ہوئے۔

نہ شیشہ ، نہ مے ، نہ ساقی رہا
فقط شکوۂ بخت باقی رہا



حواشی:

(۱) واقعات ۱۸۵۷ء کے ممتاز مؤرخ مفتی انتظام اللہ صاحب شہابی جن کی مشہور اور مسلّم تصنیفات سے اس مضمون میں خوشہ چینی کی گئی ہے، چنیاپٹن کی تاریخ اس طرح بیان فرماتے ہیں:

''پامان گھاٹ'' کے راجہ رانل کے زمانہ میں ایسٹ انڈیا کمپنی کے کارندوں نے کاسری کے زمیندار اور اُس کے دیوان سے اتحاد واتفاق کرکے دریائے شور کے کنارے تجارت گاہ تعمیر کرنے کے لئے ایک موضع ''مکدراس کویم'' حاصل کیا۔ جو تعلقہ ''پونا ملی'' سے متعلق تھا۔ راجہ نے اس کی سند طلائی لوح پر کندہ کراکے کارندوں کے حوالہ کی اور ایک ہزار دوسو ''ہون'' سالانہ اس کا پیش کش مقرر کیا، اور موضع کی مناسبت سے اس کا نام ''مدراس'' رکھا۔ کچھ دنوں بعد چند مواضع اور حاصل کرلئے گئے۔ چم، نایک، کویم، ارپوکم اور پیل پنہ۔ یہ بھی تعلقہ پونا ملی سے متعلق تھے۔ چم، نایک، کویم چونکہ مدراس کی آبادی میں شامل کرلئے گئے تھے، اسلئے قدیم نام کی مناسبت سے اس کا نام ''چنیاپٹن'' رکھا گیا۔

(۲) جی، ڈبلیو، فارسٹر کی شہادت ملاحظہ فرمائیے:

وہ عالم باعمل ہونے کی وجہ سے مولوی تھا۔ روحانی طاقت کی وجہ سے صوفی تھا اور جنگی مہارت کی وجہ سے وہ سپاہی اور سپہ سالار تھا۔ احمد شاہ نام تھا۔ ظلم طبیعت میں نہیں تھا۔ ہر انگریز اس کو قدر کی نگاہ سے دیکھتا ہے۔ (ہسٹری دی انڈین نیوٹی)

(۳) ۱۶۸۷ء میں اورنگ زیب عالمگیر نے ''گولکنڈہ'' پر قبضہ کرکے قطب شاہی خاندان کا خاتمہ کیا۔ آخری بادشاہ ابوالحسن تانا شاہ تھے جو عبداللہ قطب شاہ کے داماد تھے۔ جب اس خاندان میں حکومت نہ رہی تو ابوالحسن کے پوتے ''چنیاپٹن'' جابسے اور وہاں کے نواب کہلائے۔ اس خاندان کے نامور بزرگ سید جلال الدین عادل تھے۔ رحمۃ اللہ (مفتی انتظام اللہ شہابی)

(۴) مولوی احمد اللہ شاہ اور پہلی جنگ آزادی، از مفتی انتظام اللہ شہابی۔

(۵) ایضاً ص:۱۰۔

(۶) ایضاً ص:۱۰۔

(۷) نواب وزیر الدولہ نے حضرت سید احمد شہیدؒ اور مولانا اسمٰعیلؒ صاحب شہید سے تربیت پائی تھی۔ یہ بزرگ سماع کے سخت مخالف تھے۔ پھر نواب صاحب موصوف حضرت مولانا سید نصیر الدین صاحب دہلوی سے بیعت ہوئے تھے۔ مولانا نصیر الدین صاحب بھی حضرت سید صاحب شہید سے تربیت یافتہ اور اُن کے خلفاء میں سے تھے۔ جس کی تفصیل پہلے گذر چکی ہے۔

(۸) منشی ذکاء اللہ خاں صاحب کی شہادت پہلے گذر چکی ہے کہ ۱۸۵۷ء کے جہاد میں شریک ہونے والے وہابی مجاہدین سب سے زیادہ ٹونک سے آئے تھے جن کی تعداد دو ہزار تھی۔

(۹) آپ گوالیار کے ایک رئیس کے یہاں پیادوں میں ملازم تھے۔ رئیس کا نام سردار ستولے تھا۔ (ایسٹ انڈیا کمپنی اور باغی علماء، ص:۹)

(۱۰) مولوی احمد شاہ اور مفتی انتظام اللہ صاحب۔

(۱۱) چند صفحات بعد آپ ملاحظہ فرمائیں گے کہ آگرہ میں مولانا سید احمد اللہ شاہ کے ہم نواؤں پر ایک مقدمہ چلایا گیا تھا۔ مارچ ۱۸۵۰ء میں ابتدائی عدالت سے اس کا فیصلہ سُنایا گیا۔ مولانا سید احمد اللہ شاہ صاحب دہلی سے آگرہ تشریف لے گئے تھے۔ آگرہ پہنچ کر حلقۂ اثر قائم کرنے اور اس درجہ رسوخ حاصل کرنے میں (کہ حکومت اُن کے اُن ہمنواؤں پر جو حکومت کے اعلیٰ منصبوں پر فائز تھے مقدمہ چلانے پر مجبور ہوئی) تین چار سال یقیناً صرف ہوئے ہوں گے۔

(۱۲) مفتی انتظام اللہ صاحب شہابی آگرہ کے قدیم باشندے تھے۔ آپ سے زیادہ آگرہ کے حالات اور ماضی قریب کی تاریخ سے کون واقف ہوسکتا ہے۔ آپ تحریر فرماتے ہیں:

جاٹوں اور مرہٹوں کے زمانہ میں آگرہ کی حالت بیحد زبوں ہوچکی تھی۔ (۱) مُلا ولی محمد شاہ کی درس گاہ محلّہ بالوگنج میں تھی۔ مولوی شمس الضحیٰ اور مولوی بدر الدجی اور میر اعظم علی اعظم اسی درسگاہ کے فارغ التحصیل عالم تھے۔ (۲) مولوی محمد معظم جن سے مکتب میں مرزا غالب نے پڑھا۔ (۳) میاں نظیر کا مکتب محلّہ مائی تھان میں تھا۔ یہاں ہندوؤں کے چند بچے تعلیم پاتے تھے۔ حکیم غلام قطب الدین خاں باطن (صاحب نغمۂ عندلیب) وخلیفہ گلزار علی اسیر یہ اُن کی درسگاہ کے تعلیم یافتہ تھے۔ (۴) مولوی امجد علی اصغر کا مدرسہ محلّہ تاج گنج میں تھا۔ یہ تھی کل کائنات اکبرآباد کے درس وتدریس کی۔ گنتی کے چند لوگ پڑھے لکھے تھے قاضی سید باسط علی خاں ہمدانی آگرہ کے قاضی القضاۃ تھے۔ مرہٹوں نے اُن کو معزول کرکے للّو بھٹ کو قاضی القضاۃ بنادیا۔ باسط علی خاں مرافعہ کرنے شاہ عالم ثانی کے پاس دلی پہنچے۔ البتہ مرہٹوں نے کچھ خانقاہوں کو جاگیریں ضرور دیں۔ بہرحال حکمران طبقہ کا اثر یہ تھا کہ مسلمان شعائر اسلامی سے دُور ہٹ گئے تھے۔ نماز روزہ کی طرف سے تغافل برتا جاتا تھا۔ متولیانِ مسجد جامع اکبری نے مسجد کی زیریں دکانیں ہندوؤں کے ہاتھ رہن رکھ دی تھیں۔ جامع مسجد کا مصرف صرف یہ رہ گیا تھا کہ اس کے صحن میں کبوتروں کی قلقلیں کھڑی کی جاتی تھیں اور سوتی رسی بٹنے کے کرگھے لگے ہوئے تھے۔ بیچ کے در میں چند چٹائیاں پڑی رہتی تھیں۔ گنتی کے لوگ نماز پڑھتے تھے۔ جمعہ

کی نماز میں بیس پچیس مسلمان شریک ہوتے تھے۔ امیر الامراء ذوالفقار الدولہ نجف خاں کے زمانہ سے البتہ تعزیہ داری کا رواج بڑھ گیا تھا۔ تعزیوں پر عرضیاں چڑھتیں۔ چڑھاوا صدہا روپیہ کا چڑھتا۔ تعزیہ کا ساتویں اور نویں کی شب میں ''ناف شہر'' کا گشت کرایا جاتا تھا۔ عمائد شہر باندھ کر ساتھ ساتھ تعزیہ کے ساتھ چلتے اور کاندھا دیتے۔ دسویں کی صبح الوداع پڑھی جاتی۔ ہزار ہا مسلمان عورت مرد جمع ہوتے تھے حتیٰ کہ مولانا غلام امام شہید الوداع پڑھتے تھے۔ بچوں کو تعزیہ پر رہن رکھا جاتا وغیرہ وغیرہ۔ مسلمانوں میں عام طور سے ہندوانی رسوم کی گرم بازاری تھی۔ دیوالی اور ہولی میں برابر ہندوؤں کے شریک ہوتے۔ اس کیفیت کا پورا نقشہ میاں نظیر نے اپنی نظمیات میں کھینچا ہے۔ اُن کے پوتے سوانگ بھرتے تھے اور شہر کا گشت لگاتے۔ سیتلا کے مندر کے ہندو اور مسلمان ہر دو مجاور اور مہنت چڑھاوے کے برابر کے حصہ دار ہوتے تھے۔ یہی حال کمال خاں کے کنویں کا تھا۔ یہ تھی عام حالت مسلمانوں کی۔ صدر نظامت ۱۸۲۵ء میں الہ آباد سے آگرہ آیا تو علماء جو وابستگانِ صدر تھے وہ بھی ساتھ آئے۔ تب یہاں علماء کی صورتیں نظر آنے لگیں۔ پہلے جمعہ میں مولی سراج الاسلام پیش کار نے نماز جمعہ پڑھائی تو اَسّی (۸۰) آدمی اس میں شریک تھے۔ تمام شہر میں یہ شہرہ تھا کہ عظیم الشان جمعہ ہوا (مولوی احمد اللہ شاہ از مفتی انتظام اللہ شہابی، ص: ۱۲ تا ۱۴)

(۱۳) مولوی احمد اللہ شاہ از مفتی انتظام اللہ شہابی، ص: ۱۵۔

(۱۴) مفتی انتظام اللہ صاحب شہابی راوی ہیں کہ شاہ صاحب کے یہاں محفل سماع کا خاص اہتمام ہوتا تھا۔ مریدین پر توجہ ڈالی جاتی۔ ادھر لوہے کے کڑاہوں میں کوئلہ کے انگارے بھرے رہتے تھے۔ وہ مجلس میں پھیلا دیئے جاتے تھے۔ اُن پر مریدین لوٹتے تھے۔ آگ اُن پر بالکل اثر نہ کرتی تھی۔ میری پھوپھی محترمہ عمدۃ النساء زوجہ خواجہ غلام غوث خاں بہادر ذوالقدر بیخبر الہ آبادی فرمایا کرتی تھیں کہ اُن کے چھوٹے بھائی ڈاکٹر الہام اللہ مرحوم پر شاہ صاحب کی خاص توجہ تھی اور وہ اُن کے مرید تھے۔ وہ بھی شریک محفل سماع ہوتے اور دہکتے ہوئے کوئلوں پر مثل ماہی بے آب تڑپتے، مگر جسم پر نشان تک نہ پڑتا۔ (ایسٹ انڈیا کمپنی اور باغی علماء، ص: ۲۳)

(۱۵) روشن مستقبل، ص: ۸۰ (بار چہارم)

(۱۶) سعد الاخبار، ص: ۱۴۸ جلد اوّل مورخہ ۱۷؍ جمادی الاوّل ۱۲۶۶ھ مطابق مارچ ۱۸۵۰ء۔

(۱۷) خان بہادر مفتی انعام اللہ ابن مفتی محمد اسحاق سہروردی ابن مفتی محمد ولی نبیرہ ملّا وجیہ الدین (یکے از ترتیب دہندگان فتاویٰ عالمگیری) ۱۲۰۶ھ میں پیدا ہوئے۔ والد ماجد سے علوم عربی کی تحصیل کی۔ فراغت کے بعد لکھنؤ گئے۔ عرصہ تک نظامت کی تمنا میں رہے۔ ناکامی پر مرشد آباد گئے۔ پھر کلکتہ پہنچے۔ وہاں سر ایڈورڈ کولبرک سے تعلق ہوگیا۔ ان کا لڑکا مسٹر شیر ان اُن سے فارسی پڑھتا تھا۔ کولبرک دلی کے ریزیڈنٹ مقرر ہوئے تو مفتی صاحب اس کے ہمراہ دلّی آئے۔ اُس نے اپنے محکمہ کا سررشتہ کردیا۔ عرصہ تک وہاں رہے۔ محکمہ قضا میں بعہدہ وکالت (مفتی) مقرر ہوئے۔ جس زمانہ میں صدر نظامت الہ آباد میں قائم ہوا، محکمہ قضا شکست ہوگیا۔ آپ الہ آباد آئے اور محکمہ صدر میں وکیل مقرر ہوئے۔ صدر آگرہ آیا تو آپ بھی اس کے ہمراہ آگرہ آگئے۔ ۱۲۶۶ھ عہدہ دارانِ صدر پر رشوت کا مقدمہ چلایا گیا، تو آپ کو بھی اس الزام میں معطل کردیا گیا کہ آپ کے یہاں سے کچھ خطوط برآمد ہوئے تھے۔ اپیل میں آپ بحال کردیئے گئے لیکن آپ اس تعلق سے خاطر برداشتہ ہوچکے تھے۔ بحالی کے بعد آپ نے استعفیٰ دیدیا۔ پھر آپ نواب وزیر الدولہ کے پاس ٹونک چلے گئے۔ وہاں آپ کو بندوبست کا مہتمم بنادیا گیا۔ وہیں سے آپ حضرت مولانا احمد اللہ شاہ صاحب کو امداد پہنچاتے رہے۔ انقلاب ۱۸۵۷ء کے بعد ۲۱؍ ذی الحجہ ۱۲۷۵ھ/ ۱۸۵۸ء کو آپ کا انتقال ہوا۔ (ایسٹ انڈیا کمپنی اور باغی علماء، ص: ۲۷ و ۲۸)

(۱۸) ایسٹ انڈیا کمپنی اور باغی علماء، ص ۲۷۔

(۱۹) ایضاً، ص: ۳۳۔

(۲۰) مولانا رحمان علی صاحب مصنف تذکرہ علماء ہند نے آپ کا پورا نام امیر الدین علی لکھا ہے۔ وطن عزیز امیٹھی تھا۔ یہی اجودھیا جہاں ۱۹۵۰ء سے بابری مسجد کا قصہ چل رہا ہے کہ ہندوؤں نے اس بناء پر کہ اس مسجد کے ایک حصہ کو وہ رام چندر جی کا

رسوئی گھر کہتے ہیں، اس پر قبضہ کرکے اس میں مورتی رکھ دی ہے، مسلمان اس کے خلاف قانونی کارروائی کرنے پر مجبور ہیں۔ چنانچہ مقدمہ چل رہا ہے۔ اسی اجودھیا میں ایک قطعہ کا نام ہنومان گڑھی ہے جہاں عالمگیر کی بنوائی ہوئی ایک قناتی مسجد تھی۔ سوسال پیشتر ۱۸۵۵ء میں بھی یہاں یہی شورش ہوئی تھی۔ چنانچہ اس قناتی مسجد پر اور ساتھ ہی بابری مسجد پر ہندوؤں نے قبضہ کرلیا تھا۔ واجد علی شاہ کا دورِ حکومت تھا۔ وہ بذاتِ خود کمزور ہو یا مضبوط۔ مگر اس کی حکومت کے ساتھ انگریزی ریزیڈنٹ کے غیر معمولی اقتدار اور جابجا مداخلت نے جو دوعملی کر رکھی تھی، اُس کا قدرتی اور لازمی نتیجہ یہ تھا کہ نظامِ حکومت معطل اور مفلوج ہوکر رہ گیا تھا۔ اجودھیا اور اس کے قرب و جوار کے ہندوؤں نے بذاتِ خود یا کسی کے ایما سے اس کمزوری کا فائدہ اُٹھایا اور من مانی کارروائی کرلی۔ واجد علی شاہ کے عُمّال نے اس دست درازی کو ختم کرنا چاہا تو آس پاس کے زمیندار اور با اثر ہندو مقابلہ پر آگئے۔ واجد علی شاہ کے افسروں کے پاس مصالحت کے سوا چارۂ کار نہ تھا۔ لیکن مسلمان ایسی صلح پر راضی نہ تھے جس کے نتیجہ میں اُن کو مسجد سے دستبردار ہونا پڑے۔ چنانچہ غلام حسین شاہ کی زیرِ قیادت مسلمانوں کی ایک جماعت خانۂ خدا کو دوبارہ اذان ونماز سے آباد کرنے کے لئے وہاں پہنچی۔ اُن کے رفقاء اور معاونین میں مولوی محمد صالح، حسن علی خاں ابن احسان علی خاں رسالدار، رستم علی خاں و بہادر علی خاں کسی قدر ذی حیثیت اور نمایاں تھے۔ باقی ساتھی وجاہت دُنیا سے بے نیاز، شوقِ شہادت سے سرشار تھے۔ انگریز اور ہندوستانی افسر بھی پولیس اور فوج کی جمعیت کے ساتھ وہاں پہنچے۔ لیکن عجیب بات یہ ہے کہ ان سب کی موجودگی میں ان تمام مسلمانوں کو جو مسجد میں دو تین روز سے بھوکے پیاسے پڑے تھے، ذبح کردیا گیا۔ ان کی تعداد ۲۶۹ بتائی جاتی ہے (قیصر التواریخ جلد دوم، ص:۱۱۲ و تاریخ اودھ جلد ۵، ص:۲۰۶) عذر یہ کیا گیا کہ حملہ آور ہندوؤں کی تعداد زیادہ تھی جس پر پولیس اور فوج کی موجودہ تعداد قابو نہیں پاسکتی تھی۔ یہ حادثہ ۱۲/ذی قعدہ ۱۲۷۱ھ، ۲۸/جولائی ۱۸۵۵ء کو پیش آیا۔ بلغ العُلیٰ بکمالہٖ (۱۲۷۱ھ) سے اس کی تاریخ نکالی گئی۔ بہرحال اس ہنگامہ سے پورے ہندوستان میں بے چینی پھیل گئی۔ واجد علی شاہ کی حکومت نے کچھ ہندوؤں سے معذرت کرا کر اور کچھ تحقیقات کا سلسلہ شروع کرا کر اس قصہ کو رفع دفع کرانا چاہا۔ مگر دوسری طرف عام اضطراب جو دن بدن بڑھ رہا تھا۔ بقول سیّد کمال الدین حیدر حسنی الحسینی مصنف قیصر التواریخ، جب فسادو ہنگامۂ ہنود بڑھا اور بظاہر ثابت و متحقق ہوا کہ رعایت و پاسداری ہنود بطمع دنیا ارا کین دولت کو منظور ہے۔ مولوی سیّد امیر علی بندگی میاں کے پوتے ساکن قصبہ امیٹھی نسبتی بھائی شیخ حسین علی کارندہ راجہ نواب علی خاں رئیس محمود آباد، بہ سبب جوشِ حرارت اہلِ اسلام چاہا کہ دفع توہین اسلام کریں۔ چنانچہ پہلے سندیلہ میں اہلِ اسلام نے مولویوں کی تحریک سے بعد مشورہ اجماع کمر جہاد پر باندھی۔ (قیصر التواریخ، ص:۱۲۰)۔ بہرحال یہ پس منظر تھا مولوی امیر علی شہید کے جہاد کا۔ مولانا امیر علی رحمۃ اللہ علیہ نے جب علم جہاد بلند کیا تو مولانا رحمان علی کے الفاظ میں، علماء سُنّی وشیعہ بہ پس وپیش افتادند کسے بفقدانِ شرائطِ فرضیتِ جہاد لب کشادہ، دیگرے شرط امامت پیش نہادہ۔ علماء کی یہ پس وپیش اور واجد علی طفل تسلّی اور لیت ولعل جاری رہی۔ مگر جو موت کو زندگی پر ترجیح دے چکا تھا۔ جس کو مولانا رحمان علی صاحب امیر المجاہدین فرماتے ہیں وہ ''عزم بالجزم بسوئے مقصود کردہ روانہ شد''۔ واجد علی شاہ اب بھی پس وپیش ہی میں تھے۔ ریزیڈنٹ نے کپتان بارلوگی کو حکم دیا وہ لشکرِ جرّار اور توپ خانہ لے کر پہنچا۔ شجاع گنج میں تمام مجاہدین کا محاصرہ کرکے توپ دم کردیا۔ مجاہدین کی تعداد چھ سو تھی۔ سب ہی شہید ہوگئے۔ مگر مقابلہ بھی ایسا کیا کہ توپوں کی زد میں ہونے کے باوجود اپنے سے دوچند (۱۲۵۰) کو مقتول و مجروح کردیا۔ خاص معرکہ کے وقت کسی ارادت مند نے حضرت شاہ امیر علیؒ سے عرض کیا۔ حالات اچھے نہیں۔ کسی محفوظ مقام پر نکل چلئے۔ شہید کی زبانِ حق ترجمان نے فوراً جواب دیا۔ ''سرِ میدان کفن بردوش دارم''۔ عجیب اتفاق، شہادت کے بعد تاریخ کی جستجو ہوئی تو یہی مصرعہ موزون ہوا منشی ظہیر الدین خلف منشی مسعود بلگرامی نے اس کی تظمین کرکے یہ قطعہ بنادیا۔

بتاریخِ شہیدانِ کفن پوش — چہ حاجت تاسنش من برنگارم
کہ خود فرمود آں میرِ شہیداں — سرِ میدان کفن بردوش دارم

۱ ۲ ۷ ۱ ھ

(تذکرہ علماء ہند، ص:۳۰)

(۲۱) بے شک یہ حضرت شاہ صاحب کی گفتگو اور اُن کی قوتِ ارادی کا اثر ہے کہ حضرت مولانا فضل حق صاحب خیرآبادی کی زندگی میں انقلاب برپا ہوگیا۔ لیکن یہاں حضرت مولانا صدرالدین صاحب آزردہ کی فرزانگی اور دُوراندیشی کی بھی داد دینی چاہئے کیونکہ اگر زمام قیادت حضرت مولانا اسمٰعیل شہید کے کسی جانشین کے ہاتھ میں ہوتی، اور مرکز دہلی ہوتا تو شاید مولانا خیرآبادی میں یہ انقلاب اب بھی برپا نہ ہوتا۔

(۲۲) باغی علماء، ص:۳۸

(۲۳) لکھنؤ میں مولانا احمد سعید سبط شاہ غلام علی نے عَلَمِ محمدی اُٹھا رکھا تھا اور عوام میں عام بے چینی پیدا ہوگئی تھی مگر کرتا دھرتا کوئی نہیں تھا۔ حضرت احمداللہ شاہ کے پہنچتے ہی ہر ایک ان کی خدمت میں حاضر ہونے لگا اور تمام منتشر مجاہدین آپ کے پاس جمع ہوئے۔ سرہنری لارنس چیف کمشنر لکھنؤ نے حتی الوسع بغاوت کو فرو کرنا چاہا مگر سعی بے نتیجہ رہی۔ (باغی علماء، ص:۳۸)

(۲۴) جولائی ۱۸۵۷ء کو رسالدار سیّد برکات احمد اور راجہ لال سنگھ اور شہاب الدین وغیرہ نے شہزادہ مرزا برجیش قدر خلف واجد علی شاہ کو اودھ کا بادشاہ بنا کر تخت پر بٹھا دیا۔ مسند نشینی کے وقت جہانگیر بخش صوبہ دار توپ خانہ فیض آباد نے ۲۱ ضرب توپ کی سلامی دی۔ شرف الدولہ محمد ابراہیم علی خاں کو خلعت وزارت عطا ہوا۔ جرنیلی کا خلعت حسام الدولہ کو ملا۔ مگر کل وجزو کے اختیارات ناصرالدولہ علی محمد خاں عرف مموخاں کے ہاتھ میں تھے۔ (باغی علماء، ص:۳۸)

(۲۵) مموخاں، اصل نام علی محمد خاں، داروغہ دیوان خاص۔ برجیش قدر کو مسند حکومت تک پہنچانے میں ان کی کوشش کو خاص دخل تھا۔ حضرت محل کے خاص معتمد تھے۔ مگر اس عارضی شوکت واقتدار کے دور میں بھی زیادہ ستانی اور خویش پروری کی شکایت رفع نہیں ہوئی، بلکہ زیادہ ہوگئی جس کی بناء پر حضرت مولانا احمداللہ شاہ صاحب کو بار بار مداخلت کرنی پڑی۔ جس کی وجہ سے مموخاں حضرت شاہ صاحب سے بھی برگشتہ ہوگیا تھا۔ حضرت محل کے ساتھ لکھنؤ سے نکلا اور جب حضرت محل اور برجیش قدر نیپال روانہ ہوئے تو یہ بھی اُن کے ہمراہ تھا۔ دونوں ماں بیٹوں کو نیپال کے افسروں نے اپنے یہاں رہنے کی اجازت دی۔ اُن کے لئے بطور مدد معاش ایک ہزار روپیہ ماہانہ جاری کردیا۔ مگر مموخاں کی آشفتہ مزاجی اور تندخوئی اس نازک موقع پر بھی ختم نہ ہوئی۔ اُس نے نیپالی افسروں سے ایسا انداز اختیار کیا کہ انھوں نے مموخاں کو اجازت نہیں دی۔ دوسرے سپاہیوں کی طرح یہ بھی انگریزوں کی گرفت میں آگیا۔ گرفتار ہوا۔ مقدمہ چلا۔ مموخاں نے انگریزوں کی وفاداری کے ثبوت میں بہت سی چٹھیاں بھی جو بالواسطہ یا بلاواسطہ ملی تھیں، پیش کیں۔ بڑے شد ومد سے دعویٰ کیا کہ میر واجد علی جس کو کمپنی نے دس لاکھ روپیہ عطا کیا ہے میرا نائب تھا۔ اُس نے جو کچھ انگریزوں کی وفاداری میں کارروائیاں کیں وہ سب میرے مشورہ سے کیں۔ بہرحال ان تمام صفائیوں کا نتیجہ اتنا ہی برآمد ہوا کہ پھانسی کی سزا منسوخ ہوئی۔ چندسال کی قید تجویز کی گئی۔ مگر آپ نے فرار ہونے کی کوشش کی۔ کوشش ناکام رہی۔ دوبارہ گرفتار ہوئے اور انڈمان بھیج دیئے گئے۔ تقریباً پانچ سال جزیرہ انڈمان میں گذارے۔ پھر سراوک بھیج دیئے گئے۔ وہیں انتقال ہوا۔ (قیصرالتواریخ جلد دوم، ص:۳۶۷ و ۳۶۸ و تواریخ عجیب، ص:۴۳ و ۴۴)

(۲۶) ایسٹ انڈیا کمپنی اور باغی علماء، ص:۴۹۔

(۲۷) انڈین میونٹھ۔ از جی، ڈبلیو فارسٹر اسکولر، ص:۲۴؛ باغی علماء، ص:۴۳۔

(۲۸) تاریخِ شاہ جہان پور بحوالہ باغی علماء، ص:۴۹ و ۵۰۔

(۲۹) ہسٹری دی انڈین نیوٹی۔

❀ ❀ ❀